طوطے کی فطرت

ڈاکٹر اویناش امن

شیو چندر پتھ۔2، کالی مندر روڈ، ہنومان نگر، پٹنہ۔20، موبائل:9934090588

آج خورشید صاحب آفس سے لوٹے تو گھر میں داخل ہوتے ہی بیٹی نے فرمائش کی— ''ابو، ابو..... مجھے ایک طوطا چاہئے جیسا نازیہ کے پاس ہے بالکل ویسا ہی۔''

''بیٹی، ابھی پڑھائی پر دھیان دو، تمہارا سالانہ امتحان بھی قریب آرہا ہے..... کچھ دیر رک کر..... ویسے بھی مجھے کیا معلوم نازیہ کے پاس کیسا طوطا ہے، جملے کے آخر تک آتے آتے خورشید صاحب کی آواز تھوڑی نرم ہوگئی جو بیٹی کی نظروں سے بچ نہ سکی۔اس نے فوراً تاڑ لیا کہ ابو کی رضامندی اسے حاصل ہوگئی ہے پھر بھی اپنی مانگ کو مزید تقویت بخشنے کی نیت سے اس نے کہا—

''ابو اب طوطا تو طوطا ہی ہے— کوئی سا بھی لائیے، مگر مجھے طوطا چاہئے تو چاہئے۔''

''اب یہ کون سا نشہ سوار ہوگیا؟'' خورشید صاحب تھوڑے تیز لہجے میں بولے جو فقط اہلیہ کو سنانے کی خاطر تھا جسے ان کی بیگم نے پتہ نہیں سنا بھی یا نہیں۔سچ تو یہ ہے کہ خورشید صاحب خود پالتو جانوروں اور پرندوں کے خاصے شوقین تھے اور طوطا تو انہیں حد درجہ پسند تھا، یہ بات اور تھی کہ ان کی یہ خواہش کبھی تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔طالب علمی میں سوچا کرتے کہ یہ کتّا پالوں گا، وہ بلی رکھوں گا، اصلی پہاڑی مینا مل جائے تو کیا بات اور طوطا ایسا رکھوں گا جو میری ہر بات کی نقل اتارے گا، ذرا تعلیم سے تو فراغت حاصل کرلوں۔

خورشید صاحب تعلیم سے فارغ ہوگئے۔نوکری حاصل کرلی۔ شادی ہوگئی۔اہلیہ ملیں جنہیں پالتو چرند پرند سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔کبھی دبی زبان سے انہوں نے اہلیہ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا تو وہ لگیں جھلانے—

''پہلے سے ہی گھر کے کام کیا کم ہیں؟ جو اوپر سے مزید آفت۔ خود تو جناب کھا پی کر آفس چلے جائیں گے اور اپنے لئے بچوں کا بوجھ بھی میرے سر مسلط کر جائیں گے۔انسانوں کو بھی دیکھو اور جانوروں کو بھی۔صبح سے شام تک لگے رہو۔کیا مجال کہ کبھی آدھے گھنٹے کی بھی فرصت ملے؟ کام والی کے ہزار نخرے! چار دن آنا تو چار دن غائب، اوپر سے کہتے ہیں کتّا لائیں گے، طوطا لائیں گے! صاف صفائی کا ذمہ خود اٹھائیے تو لائیے۔'' خورشید صاحب خاموش رہ جاتے۔

مگر آج بیٹی کی فرمائش نے ان کے مردہ ارمانوں میں جان ڈال دی تھی۔رات کو بچوں کے سو جانے کے بعد آہستہ سے بولے—

''بیگم سلمیٰ کی تکلیف مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔''

''کیا ہوگیا اسے؟'' ان کی بیگم کا لہجہ استعجابیہ تھا جیسا کہ موقع محل کے اعتبار سے کسی کا بھی ہوتا۔

''ہونا کیا ہے؟ بیچاری طوطے کے غم میں مری جاتی ہے۔''

''کون سا طوطا؟''

''وہی جو وہ لانے کو کہہ رہی ہے۔میں نے لاکھ سمجھایا۔بیٹی ابھی طوطے ووطے کا چکر چھوڑو، پڑھائی پر دھیان دو مگر تم تو سمجھتی ہی ہو بچوں کی ضد.....''

''ہاں، ہاں میں خوب سمجھتی ہوں۔خورشید صاحب کی بیگم بیچ میں ہی بول پڑی۔سب آپ کا چڑھایا بڑھایا ہے۔سوچا ویسے تو مانوں گی نہیں تو بچوں کا سہارا لے لیا۔''

خیر کافی مان منول اور سمجھانے بجھانے کے بعد اس شرط پر بات بنی کہ طوطا آئے گا تو اس کی دیکھ بھال اور صاف صفائی کی تمام ذمہ داری خورشید صاحب اور بچوں کی ہوگی۔خورشید صاحب نے بھی سوچا چلو ایک دفعہ طوطا آ تو جائے پھر دیکھتے ہیں۔

صبح فیضی کو معلوم ہوا تو وہ اڑ گیا نہیں طوطا نہیں ہم تو کتّا لائیں گے بڑے بڑے بالوں والا سفید جھبریلا جس کی آنکھیں بھی بالوں سے ڈھکی ہوتی ہیں جیسا گولو کے پاس ہے۔خورشید صاحب نے تخمینہ لگایا.....اگر فیضی کی بات مانی جاتی ہے تو کتّا کم از کم پانچ سو کا پڑے گا اور اگر سلمیٰ کی بات مان لیتا ہوں تو بیس پچیس روپے

میں کام چل جائے گا اور پھر جیسا کہ ایک عام متوسط نوکری پیشہ گھر میں ہوتا ہے پیسے پر جا کر بات اٹک گئی اور طوطا کتّا پر بھاری پڑ گیا۔ طے ہوا کہ آفس سے لوٹتے وقت خورشید صاحب میر شکار ٹولی جائیں گے اور وہاں سے طوطا خرید کر لائیں گے۔ یہ فیصلہ فیضی کے لیے پسندیدہ نہ تھا۔

''ابو آپ سستے پر جا رہے ہیں۔ طوطا پوس نہیں مانتا۔ کبھی آپ کا پالتو نہیں بنے گا۔ آپ کچھ بھی کرو جس دن موقع مل گیا اسی دن پھر۔ یہ آپ کے بیس پچیس بھی جائیں گے پانی میں، کہے دیتا ہوں!''

خورشید صاحب نے اسکوٹر اسٹارٹ کر دیا۔ راستے میں سوچتے چلے .....کوئی پالتو جاندار پہلے گھر تو آئے۔ کتّا پھر کبھی، ابھی بیگم کے دانت دکھوانے ہیں۔ کہتی ہے ایک طرف سے اسے چبایا نہیں جاتا۔ اگلے مہینے بچوں کے ری ایڈمیشن اور کتابوں کا جھمیلا پھر اپنا چشمہ بھی تو ڈاکٹر کو دکھوا کر بدلوانا پڑے گا۔ اب نمبر صحیح کام نہیں کرتا اور ابھی کتّے پر پانچ سو خرچ، وہ بھی پانچ سو میں چھوٹا سا پلا دے گا، بچے گا یا نہیں بچے گا اللہ جانے۔ سوچتے سوچتے خورشید صاحب دفتر پہنچ گئے۔

شام کو ایک نہایت ہی خوبصورت اینی نسل کا عمدہ طوطا گھر آ گیا۔ طوطے کو دیکھ کر سلمٰی خوشی سے خورشید صاحب سے لپٹ گئی۔ ابو نازیہ کے پاس بھی بالکل یہی طوطا ہے۔ طوطے کو دیکھ کر خورشید صاحب کی بیگم بھی بغیر مسکرائے نہ رہ سکیں۔ فیضی نے برا سا منہ بنایا اور کمرے کے اندر جا کر لوٹ پوٹ پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔

سلمٰی طوطے کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ طوطا کبھی سر ادھر گھماتا، کبھی ادھر۔ کبھی پنجوں سے اپنی گردن کھجاتا۔ معلوم ہوتا تھا نئے ماحول میں اسے اجنبیت کا احساس ہو رہا ہے۔

''سلمٰی اسے کچھ کھانے کو دو۔''

''جی ابو۔''

سلمٰی فوراً باورچی خانے سے روٹی کا ٹکڑا لے آئی اور پنجرے میں ڈال دیا۔ طوطا بڑے تقلقے سے آیا اور روٹی کا ٹکڑا اپنی چونچ میں دبایا مگر یہ کیا.....؟ اگلے ہی پل اس نے روٹی کا ٹکڑا پنجرے میں ایک کنارے گرا دیا۔

''دیکھئے ابو طوطے نے روٹی نہیں کھائی۔''

''ہو سکتا ہے روٹی اسے پسند نہیں آئی ہو۔ کچھ اور دے کر دیکھو۔''

''سلمٰی بریڈ لے کر آئی اور آدھا توڑ کر پنجرے کی جالی سے اندر ڈال دیا۔ بریڈ کے ساتھ بھی طوطے نے وہی سلوک کیا۔''

بیگم جو پاس میں بیٹھی تھیں، ان سے برداشت نہیں ہوا بولیں—

''پوچھا نہیں تھا طوطا خریدتے وقت طوطے والے سے کہ اسے کھلانا کیا ہے؟''

خورشید صاحب جو خود کو ٹھگا سا محسوس کر رہے تھے تھوڑا سنبھلتے ہوئے آہستہ سے بولے—

''ہاں..... کہہ تو رہا تھا جو دیا جائے گا، کھا لے گا۔''

''تو کھا کیوں نہیں رہا ہے؟'' اب کے بیگم کا لہجہ تھوڑا تلخ تھا۔

''میں کوشش تو کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے نئی جگہ ہے ایڈجسٹ ہونے میں تھوڑا وقت لگ جائے۔''

''ابو تھوڑا انار بچا ہے، اسے کھلا کر دیکھتی ہوں۔''

''ہاں! ہاں! لاؤ.....'' خورشید صاحب کو تھوڑی امید بندھی۔

سلمٰی نے بڑی احتیاط سے انار کے دانوں کو الگ کر کے ایک چھوٹی کٹوری میں ڈال کر آہستہ سے پنجرے کا دروازہ کھول کر اندر ڈالا اور خورشید صاحب نے تیزی سے دروازہ بند کر دیا۔ طوطا کٹوری کے قریب آیا ادھر ادھر منہ گھمایا اور کٹوری سے انار کے دانے دھیرے دھیرے اٹھانے لگا، لیکن ابھی بھی بات جم نہیں رہی تھی۔

''چلو، طوطے نے کچھ کھانا تو شروع کیا۔'' خورشید صاحب نے سرد آہ بھری۔

تبھی سلمٰی گلاس میں دودھ لے آئی اور پنجرے کے اوپر سے کٹوری میں گرانا شروع کیا۔ طوطا یکبارگی گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا، لیکن سلمٰی کے ہٹتے ہی پھر سے کٹوری کے قریب آیا اور اس دفعہ دیکھتے ہی دیکھتے پوری کٹوری صاف کر گیا۔

سلمٰی یہ دیکھ کر خوشی سے اچھل اچھل کر تالیاں بجانے لگی۔ طوطے نے کھا لیا.....طوطے نے کھا لیا۔

ہاں..... ہاں کھائے گا کیوں نہیں؟ بیگم جواب کپڑے دھونے میں مشغول ہو گئی تھیں وہیں سے چلائیں.....

یہاں انسان کو دودھ انار نصیب ہوتا نہیں اب بیٹھ کر کھلاتے رہیے طوطے کو دودھ اور انار۔

خورشید صاحب خاموشی سے کمرے کے اندر چلے گئے۔ سلمٰی بولی—

''میں دوں گی اپنے مٹھو کو اپنے حصے کا دودھ۔''

''دیتی رہ اور خبردار جو میرے حصے سے نکالی بھی تو.....'' فیضی

فوراً لوٹ پوٹ ہٹا کر چلایا پھر دوبارہ اس میں ڈوب گیا۔ خورشید صاحب کی بیگم نے سنا، مگر کوئی جواب نہیں دیا۔

طوطے کو اب کھانے کو دودھ انار ملتا۔ دھیرے دھیرے اس نے کچھ اور چیزیں بھی کھانی شروع کر دیں، لیکن دودھ انار اس کے ذوق میں سرفہرست بنا رہا۔

گزرتے وقت کے ساتھ طوطا گھر میں سبھی کا چہیتا بن گیا تھا سوائے فیضی کے۔ سلمٰی نے اپنے طوطے کا نام مٹھو رکھا جیسا کہ عام طور پر رکھا جاتا ہے۔ خورشید صاحب طوطے کے لیے بڑا سا پنجرہ لے آئے جس میں مٹھو کو شفٹ کر دیا گیا۔ اس پنجرے میں دو خوبصورت کٹورے تھے۔ ایک کھانے کا اور ایک پینے کا۔ بیچ میں ایک لمبا سا ڈنڈا لگا تھا جس پر بیٹھ کر مٹھو جھول بھی سکے اور اسے پیڑ کی ٹہنی پر بیٹھے ہونے کا احساس بھی ہوتا رہے۔ بیگم جو پہلے طوطے سے بددل رہتی تھیں انہیں بھی مٹھو اب راس آ گیا تھا۔ دھیرے دھیرے مٹھو نے چھوٹے چھوٹے الفاظ بولنا بھی سیکھ لیا تھا۔ کوئی باہر سے آتا تو مٹھو خوش آمدید خوش آمدید کہتا جو سلمٰی نے اسے بڑی محنت سے سکھایا تھا۔ آنے والے بھی حیرت میں پڑ جاتے کہ کیا ہی ذہین طوطا ہے!

اب مٹھو بڑا ہو گیا تھا۔ اس کی گردن کے گرد کا لال گھیرا جو بالغ طوطے کی نشانی ہوتا ہے گہرا ہو چلا تھا۔ خورشید صاحب نے سوچا کہ کیوں نہ مٹھو کی جوڑی لگانے کو ایک طوطی گھر لے آئی جائے۔ خورشید صاحب کی اس تجویز کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ نتیجتاً وہ میر شکار ٹولی میں کافی جانچ پرکھ کرنے کے بعد ایک خوبصورت طوطی خرید کر گھر لے آئے۔ انہیں لگا کہ مٹھو اسے دیکھ کر خوش ہو جائے گا مگر یہ کیا؟ گھر کے اندر سے کوئی خوش آمدید کی آواز نہیں آئی۔ اندر داخل ہوئے تو دیکھا پنجرہ خالی اور مٹھو ندارد۔

''بیگم بیگم مٹھو کہاں ہے؟''

بیگم جو باورچی خانے میں مصالحہ پیس رہی تھیں بولیں—

''رہے گا کہاں؟ بھاگ گیا۔''

''بھاگ گیا؟ کیسے بھاگ گیا؟''

''اب میں کیا جانوں کیسے بھاگ گیا؟ آپ نے کھانا دیتے وقت پنجرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہوگا۔''

اس سے پہلے کہ خورشید صاحب کچھ کہہ پاتے فیضی سامنے آ گیا۔

''دیکھا ابو میں نہ کہتا تھا آپ کچھ بھی کریں، کتنا بھی خیال رکھیں طوطا پوس نہیں مانے گا بھاگ گیا نا۔ طوطا ہوتا ہی ایسا ہے، جب موقع ملے گا پھر ہو جائے گا۔ اب پکڑیے مٹھو کو..... اس سے تو بہتر تھا کہ کتّا.....''

''نہیں اب کوئی جانور، پرندہ گھر میں نہیں آئے گا'' خورشید صاحب بولے اور کمرے کے اندر چلے گئے۔

فیضی کی نوکری جب اپنے ہی شہر میں ہو گئی تو خورشید صاحب کی مسرتوں کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ آج کے دور میں جبکہ تمام پڑھے لکھے نوجوان نوکری کے لیے دہلی، ممبئی، بنگلور اور کولکاتہ جا رہے ہیں، ایسے حالات میں فیضی کی نوکری اپنے ہی شہر میں اور وہ بھی تبادلے وغیرہ کا کوئی جھنجھٹ نہیں! مارے خوشی کے ان کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ جسے دیکھو وہ خورشید صاحب کی قسمت پر رشک کرتا۔ ان کے ساتھ ان کے بیشتر ساتھی اب ریٹائر ہو چکے تھے۔ کسی کا بیٹا فوج میں تھا تو کسی کو سافٹ ویئر کمپنی میں حیدر آباد میں نوکری ملی تھی۔ صرف خورشید صاحب ہی ایسے تھے جن کے بیٹے کو نوکری کے لیے باہر نہیں جانا پڑا اور وہ سچ مچ الیہ سہا لیک ہو گیا۔

فیضی کو نوکری مل گئی تو خورشید صاحب نے فیضی کا رشتہ بھی ایک بڑے گھرانے کی خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکی سے کر دیا۔

جب خورشید صاحب کے ساتھی اپنے اپنے بیٹوں کا تذکرہ کرتے کہ کیسے ان کے بیٹے نوکری پر بیوی بچوں کے ساتھ رہتے ہیں اور وہ میاں بیوی اکیلے رہنے کو مجبور ہیں تو بظاہر خورشید صاحب ہمدردی دکھاتے، مگر اندر سے ان کا کلیجہ غرور سے پھول جاتا جس میں اطمینان کی بھی آمیزش ہوتی۔

وہ دل ہی دل میں خیال کرتے اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے یہ دن دیکھنے سے بچا لیا۔ بیٹے کو گھر میں ہی نوکری مل گئی۔ اب بیٹے، بہو، بچوں کے ساتھ آرام سے بچی ہوئی زندگی بسر ہو جائے گی۔

فیضی کی بیوی نے شروع شروع میں ساس سسر کی بڑی خاطر داری کی، لیکن پھر وہ جلد ہی خورشید صاحب اور ان کی بیگم کی ٹوکا ٹوکی سے اوبنے لگی۔

''بوڑھے بوڑھی کو اور کچھ کام تو ہے نہیں دن بھر بیٹھ کر نصیحت ..... دوپٹہ سنبھالو، سر کھلا جا رہا ہے، ظہر میں نماز پڑھتے نہیں دیکھا۔ کبھی بہو چائے بنانا کبھی دوا کہاں رکھی ہے۔ میں دن بھر کیا انہی دونوں میں لگی رہوں۔ میری اپنی زندگی کچھ ہے کہ نہیں؟''

شروع شروع میں فیضی بیوی کی باتوں کو ان سنا کرتا رہا، مگر آہستہ آہستہ اس نے بھی بیوی کی باتوں سے اتفاق کرنا شروع کر دیا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو، یہ دونوں جیسے جیسے عمر بڑھتی جارہی ہے سٹھیاتے جارہے ہیں۔ فیضی کہاں جارہے ہو؟ کب لوٹو گے؟ فجر کی نماز کیوں چھوڑ دی؟ اب یار دوستوں کے ساتھ نکلتا ہوں تو دیر ہو ہی جاتی ہے اوپر سے یہ مانوں چابک لے کر سوار رہتے ہیں۔ کوئی آفس کا میرا دوست ملنے آیا تو آ کر ڈرائنگ روم میں جم جائیں گے۔ کیا مجال کہ صوفے سے ہٹیں، گفتگو تک دشوار کر دیتے ہیں یہ نہیں کہ کمرے میں بیٹھ کر تسبیح پڑھیں۔ جب دو لوگ کسی بات پر اتفاق کر جاتے ہیں تو فیصلہ لینا آسان ہو جاتا ہے۔ آخر وہ دن بھی آ ہی گیا جب فیضی نے خورشید صاحب کو ان کی زندگی کے سب سے مشکل امتحان میں ڈال دیا۔

''ابو ہم پونے جارہے ہیں۔''

''کب لوٹو گے؟'' خورشید صاحب نے بدستور نظریں نیچی کئے دوا میں شہد ملاتے ہوئے پوچھا۔

''جی بتا نہیں سکتا۔''

''کیوں نہیں بتا سکتے؟ کیا وہیں بسنے کا ارادہ ہے؟''

''جی ابا۔''

''کیا؟'' خورشید صاحب کو لگا جیسے کسی نے بجلی کا ننگا تار ان کے ہاتھوں میں پکڑا دیا ہو۔

''اور یہاں نوکری؟''

''جی مجھے پونے میں ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب مل گئی ہے۔ میں نے نوکری کرتے ہوئے سمبائس سے ڈیسٹینٹ ایجوکیشن کے ذریعہ مینجمنٹ کر لیا تھا۔''

خورشید صاحب کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہیں؟ پھر بھی وہ تھوڑا سنبھلتے ہوئے بولے—

''وہ تو..... ٹھیک ہے مگر کوئی پرائیویٹ نوکری کے لیے سرکاری نوکری چھوڑتا ہے کیا؟'' فیضی کو تو مانو اس سوال کا انتظار تھا۔

''ابو سرکاری نوکری میں رکھا ہی کیا ہے؟ وہی بندھی بندھائی تنخواہ۔ میرے دوست پانچ برسوں میں پرائیویٹ سروس میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ بعض تو فارین تک گھوم آئے اور مجھے کیا ملے گا؟ ۱۰ سال کے بعد دو سو روپے کی اے سی پی، باہر جاؤں گا تو بچوں کا بھی کیریئر بنے گا۔ یہاں کی ڈگریوں کا کیا حال ہے باہر میں یہ آپ کو پتہ ہے؟..... پتہ بھی کیسے ہوگا؟ باہر جائیں گے تب نا! گھر سے دفتر، دفتر سے گھر۔ اخباروں میں جو شائع ہوتا ہے کیا باہر والے نہیں پڑھتے؟ میرے بچے میرٹ سے بھی پاس ہوں گے تو کون مانے گا؟ میں اپنے بچوں کا مستقبل اس طرح برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔''

خورشید صاحب ہکا بکا فیضی کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ دل میں آیا کہ پوچھیں، اور ہماری زندگی بھر کی قربانیوں کا کیا؟ انہوں نے نظریں گھما کر بیگم کی طرف دیکھا۔ بیگم جلدی سے دوپٹے کے کنارے سے آنکھیں پونچھتی دروازے کی اوٹ میں ہو گئیں۔ خورشید صاحب کی زبان سے پھر ایک لفظ نہیں نکلا۔

آج شام سات بجے فیضی کی ٹرین تھی۔ فیضی اور اس کی بیوی سفر کی تیاریوں میں جٹے تھے۔ ان کا جوش دیکھتے ہی بن رہا تھا۔ فیضی بھاگ بھاگ کر پیکنگ کر رہا تھا۔ خورشید صاحب کی بیوی باورچی خانے میں بیٹھ کر کھجور اور نمکین تل رہی تھی۔ تین دن کا سفر ہے۔ کھانے پینے کی دقت ہوگی۔ چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ ہیں..... ان تیاریوں کے بیچ خورشید صاحب کا کہیں پتہ نہ تھا۔

پانچ بجے کے بعد خورشید صاحب کی تلاش شروع ہوئی۔

فیضی موبائل ملا رہا تھا۔

''پتہ نہیں سنبھلتا نہیں ہے تو ابو موبائل رکھتے ہی کیوں ہیں؟''

فیضی کی بیوی چلائی۔

''یہ تو حد ہے۔ معلوم ہے آج جانا ہے تو صبح سے غائب ہو گئے تاکہ محلّہ والے کہہ سکیں بیٹے بہو نے جانے سے پہلے ملاقات بھی نہیں کی۔''

بار بار کی کوششوں کے بعد بھی خورشید صاحب سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ آخر کار چھ بجے فیضی رکشا بلا لایا۔ رکشا چلنے کو تیار تھا ہی کہ شام کے دھندلکے میں خورشید صاحب کے تھکے تھکے قدم نظر آئے۔

کہاں چلے گئے تھے؟ آج کے دن تو گھر میں رہنا تھا۔ فیضی نے شکایتی لہجے میں کہا جس میں کہیں سے بھی اپنائیت نہیں تھی۔

''بیٹے اب تم لوگ تو جا ہی رہے ہو تو ہمیں تنہائی دور کرنے کے لیے کچھ تو چاہئے تھا۔ سوچا ایک پالتو جاندار گھر میں رکھ لوں..... اور دیکھو اس بار میں طوطا نہیں لایا بلکہ تمہارے کہنے کے مطابق کتّا ہی لایا ہوں۔ تم ہی نہ کہتے تھے طوطے کی فطرت نہیں بدلتی، کہتے ہوئے خورشید صاحب نے جھولے سے ایک چھوٹا سا کتّے کا پلا آگے کر دیا۔''

○○